عالمگیریت،صارفیت اور ادب

ڈاکٹرناصر عباس نیر[1]

Abstract:

"Globalization is fierce menace that emerged from Capitalism and that is described as Creative Destruction. Creative Destruction seems to be a paradox. As the human beings progress towards industrial development, Capitalism and Globalization; its negative impact can be seen on the whole world and society. In this brief article, different aspectes of globalisation, consumerism and thier impact on literature have been discussed and analyzed."

عالمگیریت سومونہے سانپ کی مانند ہے،اور اس کا جنم سرمایہ داریت کی کوکھ سے ہوا ہے جسے آسٹریائی مفکرجوزف شیمپٹر نے "تخلیقی طور پر تباہ کن" (Creative Destruction) کا نام دیا ہے۔(۱)یہ ایک قول محال ہے۔ تخلیق،تعمیری چیز ہے،وہ تباہ کن کیسے ہوسکتی ہے؟ غالب نے کہا تھا کہ 'مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی'۔ کیا غالب آدمی کی ہستی کی تعمیر میں جس خرابی کا ذکر کررہے ہیں وہ تعمیر کا لازمی جز ہے ؟اسے تعمیر کرنے والے نے عینِ تعمیرہستی کے دوران میں رکھ دیا تھا اور کیا اسی باعث جیسے جیسے انسان کی ہستی اپنے امکانات کو افشا کرتی جاتی ہے، خرابی کی صورتیں بھی ظاہر اور کارفرما ہوتی چلی جاتی ہیں؟ نیز کیا یہی وجہ ہے کہ آدمی اپنے کسی چھوٹے بڑے خواب کو پورا نہیں کرپاتا ؟یہی نہیں اکثر بڑے خواب مایوسی و رنج کو جنم دیتے ہیں۔ کیا اس کا باعث بھی تعمیر ہستی میں مضمر وہ خرابی ہے جو کسی بھی وقت،اپنی غارت گر قوت کے ساتھ ظاہر ہوکر ہستی اور ہستی کے آدرشوں کو نابود کر سکتی ہے؟(جیسا کہ شعر کے دوسرے مصرعے میں دہقاں کے خون گرم (یعنی پرجوش جدوجہد) کو برق خرمن کا ہیولا کہا ہے)۔ اس سوال کے کئی جواب ہوسکتے ہیں،جن کے معتبریا نامعتبر ہونے کا انحصار جواب دینے والے کے نقطہ ءنظراور تناظرپر ہوتاہے۔ جو لوگ تقدیر کو حتمی سمجھتے ہیں،وہ انسانی ہستی میں موجود خرابی کا باعث، ماورائی طاقت کی منشا میں دیکھتے ہیں اور جو انسانی ارادے کی محدود آزادی میں یقین رکھتے ہیں،وہ خرابی کی ذمہ داری انسان اور ا س کے بنائے ہوئے سماجی نظام پر ڈالتے ہیں۔ایک بات بہ ہر حال طے ہے کہ خرابی موجود ہے۔ تاہم جوزف شیمپٹر نے جس تخلیق کے تباہ کن ہونے کا ذکر کیا ہے، وہ غالب کے مصرعے کی مانند قول محال تو ہے لیکن اس میں ماورائی عنصر کے بجائے، سرمایہ داریت کے تاریخی کردار کی طرف اشارہ ہے اور یہ تاریخی کردار اس نظام کے تباہ کن ہونے کی نشان دہی کرتا ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت،پرانی چیزوں کو تباہ کرتی ہے اور انھی کے ملبے سے نئی نئی چیزیں مسلسل تخلیق کرتی ہے۔ ان 'پرانی چیزوں ' میں صرف اشیاے صرف، ان کی پیداوار کے طریقے، ان کی ترسیل کے ذرائع ہی شامل نہیں، بلکہ ان چیزوں سے وابستگی بھی ہےیعنی سرمایہ داریت کسی وقفے کے بغیر نئی ایجادات کرتی ہے اور ان ایجادات کی ترسیل کے نئے طریقوں کی تخلیق کرتی ہے،اور اس سب کے نتیجے میں وہ سب طبقے، نظریات، اقدار،کلچر،زبانیں،یہاں تک کہ اقوام بھی تباہ ہونے کے خطرے سے دوچار رہتی ہیں جو پرانی چیزوں اور ان سے قدیمی وابستگی ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ یہیں سرمایہ داریت،جدیدیت کی فلسفیانہ فکر کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔تاہم واضح رہے کہ جدیدیت، پرانے کی جگہ نئے کی حمایت ضرورکرتی ہے،مگر دونوں 'نئے'

---

[1]پروفیسر شعبہ اُردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور
سابق ڈائریکٹر جنرل ، اُردو سائنس بورڈ، لاہور

کی قدر سے متعلق مختلف خیالات کی حامل ہیں۔جدیدیت میں نئے کی قدر کاتعین وجودی ہے،جب کہ عالمگیریت کی نظر میں نئے کی قدر صارفی ہے۔ وجودی قدر، آدمی کے حقیقی،لمحہ موجود کے گہرے اور مستند تجربے سے پیدا ہوتی ہے، مگر صارفی قدرکسی شے کے وقتی طور پرمفید ہونے میں ہے۔

سرمایہ اپنی مسلسل تخلیق اور لامتناہی گردش چاہتا ہے اور اپنی راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ خواہ وہ قوانین ہوں، قومیں ہوں، طبقے ہوں، زبانیں،مذاہب، کلچر، قدرتی ماحول، قدیم تاریخی مقاماتکچھ ہو،انھیں اپنی گردش کا حصہ بنالیتا ہے اور اگر رکاوٹ ڈالےتو انھیں برباد کرنے میں تامل نہیں کرتا۔ سرمائے کی مسلسل تخلیق اور لامتناہی اور ہمہ اطراف گردش نے عالمگیریت کے سومونہے سانپ کو جنم دیا ہے۔ عالمگیریت کے لیے سومونہے سانپ (Hydra-headed) کی تمثیل،اس کی ماہیت اور کارفرمائی کو کافی حد تک واضح کرتی ہے۔ اس کی کثیر شاخیں، کثیرشناختیں ہیں،مگر وہ سب ایک جگہ آکر ضم ہوجاتی ہیں یعنی یہ بہ یک وقت مرکزگریز اور مرکزیت کی حامل ہے۔ عالمگیریت اصل میں معاشی نظام ہے، جو کثیر قومی کارپوریشنوں کی مدد سے کام کرتاہے جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں(یعنی مرکزگریزہیں)اور جن میں سے اکثریت امریکی ہیں(یعنی مرکز یت کی حامل ہیں)۔اسی لیے کئی لوگ عالمگیریت کو امریکنائزیشن سے بھی یاد کرتے ہیں۔ یہ کارپوریشنیں،چھوٹے،مقامی کاروبار اورچھوٹی سرکاری ونجی کمپنیوں کو سومونہے سانپ ہی کی مانند ہڑپ کر جاتی ہیں؛ انھیں پہلے کنگال کرتی ہیں اور پھرنج کاری کے نام پر خرید لیتی ہیں۔ انسانی تخیل میں بہ مشکل سمانے والا حجم،ان کی خصوصیت ہے۔ یہ حکومتوں، ان کے آئین، اداروں سے طاقت و اختیار میں بڑی ہیں۔یہ قوانین سازی یہاں تک کہ دوسرے ملکوں کے عدالتی نظام پر فیصلہ کن انداز میں اثرانداز ہوتی ہیں۔ آپ نے چند دن پہلے پڑھا ہوگا کہ سی پیک (جوپاکستان میں عالمگیریت کے اثرات کی ایک نئی اور تاریخ ساز صورت ہے) سے متعلق منصوبوں پر پاکستانی عدالتیں ممکن حد تک حکم امتناعی سے اجتناب کریں گے۔

عالمگیریت کے اثرات پاکستانی سماج کے تمام شعبوں پر ہیں: معیشت، سیاست،تعلیم، ثقافت، ادب، زبانوں،آرٹ، ماحول، فن تعمیر، کھانے پینے کی عادات،لباس، یہاں تک کہ باہمی انسانی تعلقات پر۔اجارہ دارانہ انداز میں یکسانیت پیدا کرنا، عالمگیریت کا منشا محسوس ہوتا ہے۔ لوگ ایک جیسی اشیا استعمال کریں، ایک جیسے کھانے کھائیں،ایک جیسی عمارتیں تعمیر کریں گھروں میں ایک جیسی اشیا ہوں،ایک جیسی فلمیں دیکھیں،ایک جیسا میوزک ہو، ایک زبان میں ایک جیسا ادب پڑھیں اور ایک جیسا تعلیمی نظام ہو۔اگر چہ پاکستان میں اس طرز کا یکساں کلچر ابھی ہر جگہ نظر نہیں آتا، مگر اس جانب سفر کو ضرور دیکھا جاسکتا ہے۔ ہر چھوٹے بڑے شہر میں کپڑوں، جوتوں، برقی آلات،گاڑیوں،سیل فون کے چند برانڈز سے کر سکولوں اور ہوٹلوں کی چینز نظر آتی ہیں، جنھیں وہ اشتہارات ایک 'عالمی شناخت ' دیتے ہیں جو صرف سڑکوں پر نصب بڑے بل بورڈز پرہی نہیں، سیل فون کی سکرین پر ظاہر ہونے والی ہر ویب گاہ پر بھی نظر آتے ہیں۔انھیں دیکھ کر اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کثیر اشیا کا صرف ہی، سب سے بڑا معاشی مسئلہ اور شاید کسی ملک کے معاشی مسائل کا حل ہے۔یوں صارفیت،عالمگیریت کی لازمی ضرورت ہے۔

صارفیت اور عالمگیریت کے تعلق کی ایک جہت خالصتاً معاشی ہے۔ یعنی معاشی ماہرین اسے کس رخ سے دیکھتے ہیں اورکسی ملک کی معاشی ترقی کے امکانات سے اسے کس طور منسلک کرتے ہیں۔ دوسری جہت خالص انسانی ہے۔جہاں تک معاشی جہت کا تعلق ہے، وہ صارفیت کو معاشی ترقی اور نشوونما کا لازمی حصہ سمجھتی ہے۔ اس کی نظر میں معاشی نشوونما نام ہے، سرمائے کی اس افزائش کا جو اس کے مسلسل گردش میں رہنے سے ممکن ہوتی ہے۔ سرمائے کی مسلسل گردش اسی وقت ممکن ہے،جب بازاروں میں اشیا کی خریداری کے لیے لوگوں کے ٹوٹ پڑنے کا سماں ہو۔جب کہ عالمگیریت اور صارفیت کی انسانی جہت، اس سوال سے متعلق ہے کہ یہ انسانوں کو (بہ حیثیت فر د اور سماج) کو کیوں کر متاثر کرتی ہے۔ اس تحریر میں اسی جہت پر معروضات پیش کی جائیں گی اور وہ بھی محض اس رخ سے کہ کس طرح عالمگیریت اپنے صارفی مقاصد کے حصول کے لیے لوگوں کی 'قلب ماہیت ' کرتی ہے:انھیں سوچنے والی مخلوق سے

صارفی حیوان میں بدل دیتی ہے۔ اسی مقام پرایک تضاد کی نشان دہی ضروری ہے۔ ایک طرف بازاروں میں ہر طرح کی اشیا کی بہتا ت ہے مگر دوسری طرف دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ اپنی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔یہ دورخا تضاد ہے ؛ معاشی اور سماجی۔عالمگیری معاشی پالیسی کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ زائد اشیا زیادہ سے زیادہ منڈیوں اور گاہکوں تک پہنچیں۔ جب آبادی کا بڑ احصہ ان اشیا کو نہیں خرید پاتا تو اس کا اثر معاشی ترقی پر بھی پڑتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ یہ تضاد خود سرمایہ دارانہ نظام کا پیدا کردہ ہے،جس میں سرمایہ چند کمپنیوں اور افراد کے یہاں مرتکز ہوتاہے۔ اس تضاد کے نتیجے میں سماجی ناہمواری پیدا ہوتی ہے۔ایک طرف لوگ بسیار خوری سے مرتے ہیں اور دوسری طرف بھوک، غذائی قلت یا ناقص غذا سے ہلاک ہوتے ہیں۔

صارفی حیوان کی ترکیب خاصی ناشائستہ ہے، لیکن عالمگیریت نے انسانوں کے ذہن، جذبات اور سماج و ماحول و خدا سے ان کے تعلق کو بدل کر جو صورت دے دی ہے،اسے اسی ترکیب سے بیان کیا جاسکتا ہے۔صارفی حیوان سوچنے والی مخلوق نہیں، کسی اور کے رائج کردہ فیشن،ذوق اور رواج والی اشیا کو شکم، دل اور ذہن میں اتارنے والی مخلوق ہے،جو آپ کو دنیا بھر میں نظر آتی ہے۔لطف کی بات یہ ہے کہ عالمگیریت خود جدت پسند، اختراع پسندو انحراف پسند(یعنی Divergentفکرکی حا مل ہے)جب کہ اپنے صارفین کے لیے جو طرز فکر پسند کرتی اور رائج کرتی ہے وہ مطابقت پسند ی و تقلید سے عبارت یعنی Convergentہے۔وہ سب صارفین کو ایک ہی طرح سے سوچنے، محسوس کرنے،یکساں چیزیں پسند کرنے اور ایک طرح کی Homogenisationکو پروان چڑھاتی ہے۔ اس کا نتیجہ تخیل کا افلاس اور تنقیدی فکر سے محرومی ہے۔ آپ بہت سے اشتہارات دیکھیں گے جن میں لوگوں کو سوچنے جیسی بیماری سے محفوظ رہنے،انھیں خود فیصلہ کرنے کی تکلیف سے بچنے، خود چیزوں کو تیار کرنے کی زحمت نہ اٹھانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔"جب ہم موجود ہیں تو آپ کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"اشتہارات کا مرکزی نکتہ ہوتا ہے۔ سب کچھ بنابنایا، انسٹنٹ ملتا ہے۔ اس سے صارف کا تعلق کسی چیز سے قائم ہی نہیں ہوپاتا۔وہ ہر شے کو حاصل کرتاہے،اسے ہڑپ کرتا ہے،پھر اگل دیتا ہے،یا پھینک دیتا ہے تاکہ مزید اشیا کی بھوک پیداکرسکے۔ اس کا حال ظفر اقبال کے اس شعر کے مصداق ہوتا ہے:

چپاتیاں تھی بندھیں پیٹ پرمگر شب بھر
اُبھرتا ڈوبتا میں بھوک کے بھنورمیں رہا

صارفی حیوان در اصل عالمگیریت کی بہ یک وقت ضرورت اور پیداوار ہے۔عالمگیریت ان گنت اشیا کو دنیا بھر میں صَرف کیے جانے کے انتظامات کرتی ہے۔ عالمگیریت سے پہلے صنعتی عہد میں(بیسویں صدی کے پہلے نصف تک) اشیا اگرچہ کثیر تعداد میں تیار کی جاتی تھیں، مگر یہ اشیا انسانی ضرورتوں کو سامنے رکھتی تھیں۔ اس سے سرمایہ گردش میں تو رہتا،مگر لامتناہی گردش اس کے لیے خواب تھا۔ اس خواب کی تکمیل کے لیے ایک نئی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ انسانی ضرورتیں تخلیق کرنے کی حکمت عملی۔ جب تک(یعنی جاگیرداری عہد میں) انسان کچھ فطری،جبلی یا زیادہ سے زیادہ سماجی ضرورتیں رکھتا تھا،اسے خود پر اختیار تھا۔یعنی تن ڈھانپنے کو لباس، دو وقت کی روٹی، رہنے کو چھت اور تفریح کے لیے کچھ ثقافتی مشاغل۔انسانی طبقات کی تقسیم تھی، فرق اشیا کے معمولی و غیرمعمولی ہونے میں تھا، تعدد وکثرت میں نہیں۔البتہ کچھ چیزوں کو آسائشوں میں شمار کیا جاتا تھا،جن کے نہ ہونے کا غم کم ہی ہوتا تھا۔ اس لیے کہ یہ آسائشینان چند لوگوں کے پاس ہوا کرتی تھیں،جن سے محروم اکثریت اپنی حالت کا موازنہ نہیں کیا کرتی تھی۔تب طبقات اپنی اپنی دنیا،حالت،دائرہ کار میں رکے ہوئے یا مطمئن تھے۔اس زمانے میں ان طبقات کی تقریباً طے شدہ ضرورتوں کو سامنے رکھ کراشیا تیار کی جاتی تھیں۔یہی وجہ تھی کہ نہ تو اشیا کی تیاری میں کوئی غیر معمولی جدت سامنے آتی تھی، نہ نئی اشیا کی ایجا د کی طرف دھیان جاتا تھا۔ صنعتی عہد شرو ع ہی نئی ا یجادات اوران کی وافر مقدار میں تیاری سے ہوا۔ مابعدصنعتی عہد یعنی عالمگیریت میں نئی ایجادات کا لامتناہی سلسلہ ہے اور ان کی تعداد بے حد

وہے حساب ہے، لہٰذا سب سے اہم سوال ان کے صَرف کا ہے۔اب یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ جس طرح نئی اشیا ایجاد کی جاسکتی ہیں، اسی طرح نئی خواہشیں اور نئی ضرورتیں بھی تخلیق کی جاسکتی ہیں۔ اس کے لیے نفسیات اور سماجیات کے علوم سے خاص مدد لی گئی ہے۔شاید اسی لیے لیوتار نے معاشی عالمگیریت کے لیے ’جنسی معیشت‘ (Libidinal Economy)کااصطلاح استعمال کی ہے۔ ’جنسی معیشت ‘ دراصل انسانی جسم کی ضرورتوں کا لامحدود تصور کرتی ہے اور ان کی تسکین کے لامحدود وسائل اور طریقوں سے آگاہ کرتی ہے۔ مثلاًوہ ”جسم کو ان حدوں تک وسیع کرتی ہے، جن کا تصور کیا جاسکتا ہے۔وہ صرف ایک منھ نہیں،دوسرے،تیسرے اور ان گنت مونھوں اور نہاں جنسی اعضا کا تصور کرتی ہے۔“(۳)پہلے جسم محدودمتصور ہوتا تھاجس کی تلافی روح اور تخیل کی لامحدودیت میں یقین کی مدد سے کی جاتی تھی، مگر عالمگیری معیشت، جسم ہی کو لامحدود سمجھنے کا یقین دلاتی ہے۔ جسم اور جنس کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس کا تصور خود بہ خود لامحدود اشیا کی آرزو جگاتا ہے۔ اس سے پہلے غالب نے کہہ رکھا ہے:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان پھر بھی کم نکلے

غالب نے ہزاروں خواہشوں کا تو ذکر کیا مگران میں فرق نہیں کیا۔ یہ نہیں بتایا کہ وہ مادی وجسمانی،روحانی و جنسی، تخیلی و ذہنی میں امتیاز کرتا ہے یا نہیں۔ تاہم غالب نے خواہش کی حرکیات کو ضرور واضح کردیا کہ خواہش کی تسکین،خواہش کا خاتمہ نہیں۔خواہش پہ دم نکلنے کا مفہوم اس کے سوا کیا ہے کہ خواہش میں بلا کی شدت ہوتی ہے اور برقرار رہتی ہے، خواہ خواہش کی ایک یا زیادہ بات تسکین ہو بھی جائے۔ غالب سے پہلے بدھ مذہب میں خواہش کو انسانی دکھوں کا سبب قرار دیا گیا تھا،اور نجات ان خواہشوں سے آزادی میں دیکھی گئی تھی۔دوسرے لفظوں میں انسانی فطرت میں خواہشوں کے بے انت ہونے کا تصور موجود تھا مگر انھیں اپنے اختیار میں رکھنے کے لیے مذاہب اور فلسفے بھی موجود تھے۔ اس سے سماج میں توازن قائم رہتا تھا۔ عالمگیریت نے خواہش کی حرکیات میں ترغیب، مقابلے، جشن،تغیرجیسے عناصر کو نشان زد کیا ہے۔ یعنی ان عناصر کو جن کی مدد سے نہ تو ایک خواہش سیر ہوتی ہے، نہ خواہشوں کے ختم ہونے یا انھیں ختم کرنے کو براسمجھا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بے انت انسانی ضرورتوں کا باقاعدہ جشن منایاجاتاہے۔ جسے ہم نے صارفی حیوان کہا ہے،وہ اشیا کو صرف کرنے کا جشن مناتاہے۔ یہ جو آپ طرح طرح کے گالا اور فیسٹول : ادبی، ثقافتی، فوڈ، میوزک، ڈانس وغیرہ اور روز نئے نئے دنوں کا جشن مناتے دیکھتے اور ہرگالا، فیسٹول اور دن منانے پر عالمی برانڈز کے خصوصی ڈسکاؤنٹ جگہ جگہ دیکھتے ہیں، یہ سب عالمگیریت کے سومونہے سانپ سے متعلق ہیں،اور یہاں جو مخلوق دیکھتے ہیں وہ ہر شے کو ہڑپ کرنے کی ترغیب دل میں مسلسل محسوس کرتی ہے۔ وہ ہرشے خریدتے ہیں: نئی نئی دنیاؤں کے کھانے، طرح طرح کے ذائقے، نئے نئے لباس اور ان کے فیشن، زیور، میک اپ آئٹم،موبائل، گاڑیوں اور دیگر اشیا کے نئے نئے ماڈل۔

صارفیت کا اثر ادب و آرٹ پر بھی پڑا ہے،یعنی انسانی دنیا کی سب سے نفیس اور اعلیٰ ترین تخلیقی صلاحیتوں کے مظاہر پر۔دیکھنے والی بات یہ ہے کہ اس اثر کی نوعیت کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے تھوڑا سا پس منظر میں جانا پڑے گا۔ یہ بات مارکس و اینگلز نے ’کمیونسٹ مینی فیسٹو‘ میں لکھی تھی کہ سرمایہ داریت کے پیدا کردہ بورژوازی طبقے نے ”طبیب، قانون دان، پادری،شاعر،سائنس دان کو تنخواہ دار مزدور میں بدل دیا ہے“(۲)یعنی انھیں صرف تخیل کی آزادی اور قبل جدید عہد کے پرشکوہ،مابعد الطبیعیاتی مرتبے ہی سے محروم نہیں کیاگیا، ایک نیا کردار بھی تفویض کیا گیاہے۔ وہ اب تخلیق کار(Creator)کے بجائے،پیش کار (Producer) ہیں اور وہ جوکچھ پیش کرتا ہے وہ، پراڈکٹ، کموڈیٹی یا شے ہے۔ گویا صنعتی سرمایہ داریت کے آغاز ہی سے ادب، شے میں بدلنے لگا تھا۔ مارکس نے نہ صرف اس امر کی نشان دہی کی،بلکہ ادب کے ’پیداوار ‘ ہونے کو قبول بھی کیا۔ بعد کے مارکسی مفکرین خصوصاً والٹر بنجامین، برٹولٹ بریخت، التھیوسے، ماشرے اور ٹیری ایگلٹن نے ادب کے ’پیداوار‘، شے، کموڈیٹی ہونے کے سلسلے میں کچھ نئے نکتے ابھارے۔ مثلاً ٹیری ایگلٹن کہتے ہیں کہ اگرچہ ادب سماجی شعور کی پیداوار ہے،

مگر اس کے ساتھ وہ ایک صنعت بھی ہے۔ کتابیں صرف معنی کی ساخت نہیں ہیں، بلکہ وہ اشیا (commodities) بھی ہیں جنھیں پبلشر تیار کرتے ہیں اور مارکیٹ میں منافع پر بیچتے ہیں۔[۴]بجا کہ ادبی کتابوں کی اشاعت ایک میکانکی ومشینی عمل ہے جو مسلسل نئی نئی جدتوں سے نموکرتا اور ترقی پاتاہے، نیز انھیں بازار میں منافع کی غرض ہی سے بیچا جاتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ ادب میں معنی کی جو ساخت ہے، کیا وہ بھی شے ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا ادبی کتابیں، ایک طرف کتابوں کے اس زمرے میں شامل کی جاسکتی ہیں جو مفید، عملی، درسی، مقبول عام ہوتی ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں شایع ہوتی ہیں، اور دوسری طرف انھیں(ادبی کتب کو) اسی طرح صَرف کیا جاتا ہے جس طرح کسی دوسری شے کو؟ صنعتی عہد کا سرمایہ دار ہو یا عالمگیریت کے زمانے کا ایم۔ڈی یا سی ای او، وہ ہر طرح کی کتابوں کو محض قابل ِ فروخت اور قابلِ صَرف شے سمجھتا ہے،اور انھیں شائع کرنے سے پہلے مارکیٹ میں ان کی طلب اور اپنے منافع کی شرح کو اولیت دیتا ہے۔اسے ادبی کتاب کی معنی کی ساخت سے بذاتہ دل چسپی نہیں ہوتی، البتہ اس کے زیادہ سے زیادہ قابلِ فروخت یعنی مقبول ہونے سے سروکارہوتا ہے۔یعنی وہ کتاب اور اس کے مندرجات دونوں کو کموڈیٹی سمجھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بڑے پبلشر ہر طرح کی کتابیں چھاپتے ہیں (مخصوص موضوعات کی قید کے بغیر)، بالکل ایسے ہی جیسے بڑی کمپنیاں ہر طرح کی اشیا تیار کرتی ہیں۔ چوں کہ کموڈیٹی سمجھتا ہے،اس لیے وہ ان کی 'ذاتی قدر' اور 'نشانیاتی قدر'کی بجائے 'تبادلے کی قدر' کو اہمیت دیتا ہے۔[۵]کسی شے کی ذاتی قدر کا تعین،خود شے کرتی ہے۔قلم لکھنے کے کام آتا ہے،یہ اس کی ذاتی قدر ہے؛ کتاب سے علم، مسرت، بصیرت، دانائی حاصل ہوتی ہے،یہ اس کی ذاتی قدر ہے۔اشیا ثقافتی نظام میں کس معنویت، قدر کی حامل ہیں، یہ ان کی علامتی و نشانیاتی قدر ہے۔ کوئی چیز کتنا منافع دیتی ہے، یہ اس کے تبادلے کی قدر ہے جس کا تعین مارکیٹ کرتی ہے۔ صنعتی سرمایہ داریت، اشیا کی تبادلے کی قدر ہی کو اہمیت دیتی تھی، مگر عالمگیریت نے اشیا کی دوسری اقدار کو بھی اپنے معاشی محیط میں لینا شروع کردیا ہے۔ اب کلچر، تاریخی ورثہ، ادب کا معنی بھی برائے فروخت ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے پس منظر میں سرد جنگ اور بعض مارکسی تصورات کارفرما ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد شروع ہونے والی سرد جنگ، ثقافتی جنگ بھی تھی۔ بہ ظاہر یہ اشتراکیت اور سرمایہ داریت کے درمیان تھی، مگر دونوں ثقافت کو کموڈیٹی کا درجہ دیتے تھے اور اسے تیسری دنیا کے ممالک کی منڈیوں میں، مقابلے کی فضا پیدا کرکے 'بیچتے'تھے۔تب اکثر(سب نہیں) شاعر وادیب، ثقافتی جنگ کے سپاہی و مزدور بنائے گئے۔سرد جنگ کا خاتمہ تاریخ کا خاتمہ نہیں، مگر کبیری نظریات کے اثر کے دم توڑنے کی شہادت ضرور دیتی ہے۔ کبیری نظریات یعنی دائیں اور بائیں بازو کے نظریات میں جب تک مجادلے کی کیفیت تھی، ادب اور ادیب مرکز میں تھے؛ ان کے خیالات، ان کے مؤقف ادبی بحثوں کا مرکز تھے،اور یہ بات ادب کو محض کموڈیٹی ہونے سے بچاتی تھی،حالاں کہ امریکا و سابق سوویت یونین اپنے اپنے ادب و کلچر کو کموڈیٹی کے طور پر ہی پیش کرتے تھے۔پاکستان بھی سرد جنگ کا میدان بنا ہوا تھا۔یہاں صرف امریکی اسلحہ ہی نہیں بکتا تھا،امریکی ادب، امریکا کا بنایا ہوا نصاب تعلیم، روسی ادب اور روسی اشیا بھی فروخت ہوتی تھیں۔ اس صورتِ حال کی انتہا افغانستان میں روسی مداخلت سے شروع ہونے والی جنگ تھی،جس میں پاکستان امریکی حلیف بنا۔روس پہلے افغانستان میں ہارا، پھر اشتراکیت کوہارا۔سرد جنگ ختم ہوئی۔پاکستان میں بھی دائیں اور بائیں بازو کی کشا کش ختم ہوئی، نتیجہ دائیں بازو کی شدت پسندانہ فکر (سیاست نہیں) کے قوی ہونے کی شکل میں برآمد ہوا۔ عالمگیریت نے صرف اشیا کی بلا روک ٹوک کی ہر جگہ ترسیل کو ممکن نہیں بنایا،(سوشل میڈیا کے ذریعے خصوصاً) خیالات کی ہمہ گیر ترسیل کی راہ بھی ہموار کی ہے،مگر پاکستان میں دائیں بازو کی حمایت بڑھی ہے۔یہ الگ بات کہ یہ ایک نیا دایاں بازو ہے، جو عالمگیریت کی معاشی قوتوں سے الگ نہیں ہے!!

اسے ایک پیراڈاکس ہی کہا جائے گا کہ مارکسیت،سرمایہ داریت کو سرمائے ہی سے شکست دینا چاہتی تھی۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا،وہ ادب کے کموڈیٹی ہونے کے تصورکو چیلنج کرنے کے بجائے، اسے قبول کرتی تھی۔ یہی نہیں، وہ معاشی مساوات پر مبنی جس انقلاب کی خواہاں تھی،

اسے برپا کر نے کے لیے ضروری سمجھتی تھی کہ ادب واقعی ایک کموڈیٹی ہو،یعنی جسے 'پیدا' کیا گیا ہو، نہ کہ تخلیق کیا گیا ہو۔ تخلیق کا لفظ،مارکسی مفکروں کے یہاں عہد وسطیٰ کی اس مابعد الطبیعیاتی فکر کا ناستلجیا ابھارتا تھاجو سماجی شعور سے ورا تصور کی جاتی تھی۔ ان کی نظر میں نہ صرف سماجی شعور قابل تجزیہ ہے، بلکہ اس کی مدد سے ادب کی 'پیداوار' بھی ایک قابل فہم، بشری عمل ہے۔ کموڈیٹی عوامی ہے، ہر کہ ومہ تک رسائی چاہتی ہے۔انقلاب تبھی آسکتا ہے، جب ادب کی رسائی ہر کہ ومہ تک ہو۔اس کے لیے مارکسی مفکرین نے ادب اور اس کی 'پیداوار' کے ذرائع کو انقلابی بنانے کی کوششیں کیں۔والٹر بنجامین نے کہا کہ فنکار،فن کی پیداوار کی معاصر قوتوں کو غیر تنقیدی انداز میں قبول نہ کریں، بلکہ انھیں ترقی دیں اور انقلابی بنائیں۔(٦) یعنی ایک طرف چھوٹے بڑے یا نام نہاد اشرافی و اجلافی ادب کا فرق مٹائیں، اصناف کی حدبندیوں کو پگھلائیں، دوسری طرف فن کو وجود میں لانے والی ٹیکنالوجی کو عوامی بنائیں۔کیوں کہ اسی صورت میں وہ مارکسی آئیڈیالوجی کو عوام کی ذہنی بیداری اور انقلاب کے لیے آمادہ کرنے کے لیے بروئے کار لاسکتے ہیں۔ اس سارے عمل میں ایک تضاد تھا۔ مارکسی فنکار کے لیے تو لازم ہے کہ وہ اپنے زمانے کے سماجی شعور کو غیر تنقیدی انداز میں قبول نہ کرے، مگر اس انقلابی فنکار کے قارئین کو آئیڈیالوجی جذب کرنے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ خود انقلابی فنکار ایک 'فرد، آزاد تنقیدی فکر 'کا حامل تھا،مگر قارئین کے لیے اپنی فنکارانہ پیداوار کو ایک کموڈیٹی یا قابل صرف شے بنا کر پیش کرتا تھا۔ اس تضاد کا احساس برٹولٹ بریخت کو تھا، جسے حل کرنے کی خاطر اس نے 'بیگانگی کے اثر' (Alienation Effect)کی تھیوری متعارف کروائی۔ بریخت کی نظر میں بورژوازی تھیٹر حقیقی دنیا کو حقیقی اثر کے ساتھ پیش کرنے میں یقین رکھتا تھا۔اداکار ی کی معراج یہ تھی کہ اداکار کی نجی شخصیت اور کردار میں فاصلہ یکسر ختم ہوجائے۔ڈرامے کی خوبی یہ تھی کہ وہ روزمرہ کی حقیقی زندگی کا ہوبہو عکس نظر آئے۔ بریخت کی اس تھیٹر پر تنقید یہ تھی کہ اس طور بوژوازی تصورات کی ناظرین تک بہ آسانی ترسیل ہوجاتی تھی۔ اس نے کہا کہ تھیٹر کو محسوس کروانا چاہیے کہ وہ ایک پروڈکشن ہے۔حقیقی زندگی اور اس کی ترجمانی میں فرق باقاعدہ قابل محسوس ہونا چاہیے۔"تھیٹر کا کام کسی جامد حقیقت کو پیش کرنا نہیں، بلکہ اس بات کو نمایاں کرنا ہے کہ کس طور کردار اور ان کے اعمال تاریخی طور پر پیدا کیے گئے ہیں، وہ کس طرح مختلف رہے ہیں اور ہیں"۔(٧)یعنی ناظر کو برابر یہ احساس دلاتے رہنا چاہیے کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا ہے، وہ باہر کی روزمرہ زندگی اور اسے تشکیل پانے والی حقیقت کا ٹھیک ٹھیک عکس نہیں،بلکہ ایک فن ہے، جسے تاریخی اور آئیڈیالوجیائی شعور کے تحت پیدا کیا گیا ہے۔ اسی کو وہ 'بیگانگی کا اثر' کہتا ہے؛فن اور سماجی حقیقت ایک شے نہیں، بلکہ فن،سماجی حقیقت سے مختلف اور قدرے بیگانہ ہے۔یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں کہ بریخت، اس تھیوری میں جدیدیت کے تصور فر د ہی کو نہیں، اس کے تصورِ فن کو بھی شامل کررہا ہے۔جدیدیت نے اوّل یہ تصور پیش کیا کہ فن اصل میں ایک ہیئت ہے، جسے مخصوص لسانی وسائل کے استعمال سے وجودمیں لایا جاتا ہے۔کیا ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ بریخت، فن کے کموڈیٹی ہونے کے تصور سے خوش نہیں تھا؟ بڑی حد تک۔ یہ تصور کہ ادب اصل میں ہیئت ہے، یعنی باہر کی جامد، یک رخی حقیقت کی عکاس ہونے کے بجائے،ایک وضع کردہ، خلا وخاموشی کی حامل انسانی تشکیل ہے،اسے شے محض ہونے سے بچا سکتاہے۔ادب ہی نہیں،کلچر کے لیے بھی ضروری ہے کہ اسے تبادلے کی قدر کی حامل شے ہونے سے بچایا جائے۔ اسی صورت میں ادب ایک شے کی مانند صَرف نہیں ہوتا، بلکہ خود کومعنی کی اس ساخت کا حامل بنا کر پیش کرتا ہے،جسے انسانی فہم و ذوق کی مدد سے سمجھا جاسکتاہے، جس سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، جسے تنقیدی تجزیے کے بعد رّ یا قبول کیا جاسکتا ہے اور جسے بعد ازاں ثقافت کے اس علامتی نظام کا حصہ بنایا جاسکتا ہے،جس میں اشیا اپنی ذاتی اور علامتی اقدار کے ساتھ موجود ہوتی ہیں،اور جن کے بل بوتے پر ایک کلچر انسانی کلچر کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔تبھی صارفی کلچر کی اجارہ داری چیلنج کی جاسکتی ہے اور تبھی صارفی حیوان، ایک بار پھر سوچنے والی مخلوق کی جون میں لوٹ سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ جوزف شیمپٹر نے یہ بات اپنی کتاب Capitalism, Socialism and Democracy میں بیان کی ہے جو۱۹۴۳ءمیں برطانیہ میں پہلی بار چھپی تھی۔

۲۔ کارل مارکس، فریڈرخ اینگلز، The Communist Manifesto،ترجمہ سیموئل مور،ریڈنگز، لاہور، ۲۰۱۶ء (۱۸۴۸ء)ص۱۵

۳۔ ژان فرانسس لیوتار، Libidinal Economy، لندن، کنٹی نیوم،۲۰۰۴ء،ص ۲

۴۔ ٹیری ایگلٹن،Marxism and Literary Criticism،نیویارک،روٹلیج،۲۰۰۹ء،ص ۵۵

۵۔ یہ خیالات بادریلا کے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے، مابعد جدیدیت، نظری مباحث، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء، ص ۲۲۸تا ۲۲۹

۶۔ ٹیری ایگلٹن،Marxism and Literary Criticism،ص ۵۷

۷۔ ایضاً،ص۶۰